حضرت عمرؓ نے تھوڑی دیر کے لئے اپنا سر نیچے جھکا لیا اور سوچنے لگے۔ اس کے بعد فرمایا "یہ مال اللہ کا ہے، اور بندے اُس کے بندے ہیں، خدا کی قسم اگر میں یہ اللہ کے راستے میں نہ کر رہا ہوتا، تو اس زمین کی ایک بالشت بھی "حمیٰ" نہ قرار دیتا۔" اسی طرح اسلام میں "وقف" کا جو نظام ہے اس سے قومی ملکیت اور "تامیم" کے حق میں استدلال کیا گیا ہے۔ کیونکہ "وقف" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وقف شدہ جائداد صاحبِ جائداد کی ملکیت سے نکل کر اللہ کی ملکیت میں چلی گئی اور اللہ کی ملکیت کے معنی ہیں کہ اُس کے بندے اُس جائداد سے فائدہ اُٹھائیں۔

"تامیم" کے حق میں یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے شام وعراق کی اراضی مسلمان فاتحین میں تقسیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور حضرت معاذؓ بن جبل نے اس کی تائید میں فرمایا تھا "اے امیرالمومنین! اگر آپ نے ان اراضی کو تقسیم کر دیا تو ان کی ساری آمدنی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی، اور جب یہ مر جائیں گے تو یہ آمدنی ایک فردِ واحد مرد یا عورت کو ملے گی۔"

اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہے کہ حاکم جسے فقہاء کی اصطلاح میں "امام" سے تعبیر کیا گیا ہے، کسی ملکیت کے "حقِ مطلق" کو مقید کر سکتا ہے، جیسے کہ غیر آباد زمینوں کے آباد کرنے کے مسئلے سے واضح ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "جس نے کوئی غیر آباد زمین آباد کی، وہ اُس کی ہے" اس کے بارے میں ابو حنیفہؒ کا قول ہے "کہ بے شک یہ اُس کی ہے لیکن امام کی اجازت سے"۔ ابو حنیفہ نے یہ شرط اس لئے لگائی ہے تاکہ اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف نہ ہو۔ اور ملکیت کے حقِ مطلق کو محدود کرنے کا یہ اختیار مصلحتِ عامہ کے تحت دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں امام ابو یوسفؒ کتاب الخراج" میں لکھتے ہیں کہ اس معاملے میں امام پر واجب ہے کہ وہ جس میں مسلمانوں کی بھلائی اور عام فائدہ دیکھے، وہ کرے۔

مسلمان حکومتوں کی طرف سے جو اراضی بطور "جاگیروں" (اقطاع) کے دی جاتی تھیں ہمارے ہاں اس کے بارے میں بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس سلسلے میں صحیح صورت یہ ہے:۔ ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے بلال بن حارث مُزنی کو مدینہ کے نواح میں عقیق کا قطعہ اراضی دیا۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو آپ نے بلال سے کہا کہ رسول اللہؐ نے تمہیں یہ زمین آباد کرنے کے لئے دی تھی، اب تم نے جو آباد کی ہے، وہ تو رکھ لے، باقی واپس کر دے۔ ابو عبید نے اپنی کتاب "الاموال" میں یہ واقعہ بیان کیا ہے:۔

اگر ہم ائمۂ مسلمین میں سے بعض کبار کی تاریخ دیکھیں، تو اُن کی زندگیوں میں اسلامی اشتراکیت کی روح نمایاں نظر آئے گی۔ مقرر نے اس کے ثبوت میں حضرت عمرؓ بن خطاب اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے بعض واقعات بیان کیے اور آخرالذکر کے بارے میں بتایا کہ کس طرح انہوں نے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی وہ سارے اموال اور آراضی جو اُنہیں آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھیں، اُن کے اصل مالکوں کو لوٹا دیں۔

کتاب میں دو تقریریں اور بھی ہیں۔ ایک کمرشل کالج کے ایک پروفیسر کی، اور دوسری لاء کالج کے شعبۂ شریعت اسلامی کے پروفیسر شیخ محمد ابوزہرہ کی۔ یہاں عدم گنجایش کی وجہ سے ہم اُن کا خلاصہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

"یورپ میں جو صنعتی و معاشی انقلاب ہوا ہے، میں اسے مانتا ہوں۔ اور اس کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ اس قسم کے انقلاب کا مخالفِ دین ہونا ضروری نہیں۔ ہمارے جو دینی نظریئے ہیں ان کے مطابق اس طرح کا انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود یورپ میں وقتاً فوقتاً بعض جماعتیں یہ خیال پیش کرتی رہی ہیں، لیکن چونکہ یہ جماعتیں مذہباً عیسائی تھیں اور ان کے مذہب میں کسی صورت میں بھی تشدد کی اجازت نہیں اور معاشرے کی انسانیت دشمن اور استحصال پسند طاقتوں کو اکثر اوقات بغیر تشدد کے ختم نہیں کیا جا سکتا، اس لئے انقلاب کے حامیوں نے ان مذہبی جماعتوں کی بات نہ منی لیکن اسلام میں ایسے طبقوں کے لئے "فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ" کی صراحت موجود ہے۔

اب اگر میں یورپ کے اس انقلاب کی ترجمانی اس طرح کروں جیسے (علامہ) عنایت اللہ مشرقی نے کی، تو پھر اسلام تابع ہوگا اور یہ انقلاب متبوع۔ اور یہ صحیح نہیں۔ اس سے پہلے اس طرح کی ایک کوشش سر سید احمد خاں نے بھی کی تھی اب میں حضرت شاہ ولی اللہ کی حکمتِ اسلامی کو اصل مانتا ہوں۔ اور اسے اساس بنا کر یورپ کے انقلاب کو سمجھتا ہوں۔ اور اس کی ترجمانی کرتا ہوں۔ اس صورت میں میرا اسلام بھی محفوظ رہتا ہے۔ اور آج دنیا میں جو معاشی و انقلابی تبدیلیاں آچکی ہیں، میں ان سے بے تعلق نہیں رہتا۔"

مولانا سندھیؒ

وجود کی بحث

پروفیسر ضیا

مسلمان حکماء اور صوفیاء کے ہاں شروع ہی سے وجود کی بحث بڑی اہم رہی ہے ۔ اور اسے مسئلہ المسائل سمجھا جاتا رہا ہے ۔ اس عالم کون و مکان میں علت اور معلول کا جو سلسلہ ہے آخر وہ کہیں جا کر تو ختم ہوتا ہے ۔ اب اس سلسلے کی ابتدا کیسے ہوئی ؟ کیا علت و معلول کا یہ سلسلہ خود بخود شروع ہو گیا' یا اس کا کوئی شروع کرنے والا بھی ہے ؟ ۔ پھر اس سلسلۂ علت و معلول کا اس کے شروع کرنے والے سے کیا تعلق ہے ؟ مسلمان حکماء اور صوفیاء دونوں کا ان دقیق بحثوں میں بڑا انہماک رہا ۔ اور وہ وجود کی اصل حقیقت کے تعین میں برابر سرگرداں رہے[1] ۔ ان بحثوں میں سے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بھی ایک بحث ہے ۔ جو صرف نظری نہ رہی بلکہ اس کے عملی نتائج نے ایک وقت میں مسلمانوں کے معاشرے اور ان کی ہیئت سیاسی پر دور رس اثرات ڈالے ۔

وجود اور اس کے تنزلات کا مسئلہ بڑا عمیق ہے ۔ ذیل میں چند بزرگوں کے ارشادات کی مدد سے اس کی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے ۔

---

[1] " . . . . . . آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے ۔ اس عہد میں ان اہلِ کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے ۔ اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائقِ تصوف کی بحث کرنے لگتے ہیں ۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی ۔ ان بزرگوں نے ظہور وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کئے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا ۔ اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا ۔ الغرض یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوع بحث بن گئے ۔ (اردو ترجمہ ہمعات مصنفہ شاہ ولی اللہ)

الہ آباد کے ایک مشہور بزرگ شاہ محمد حسین صاحب اس مسئلے پر یوں بحث فرماتے ہیں:۔

"جب ہم موجودات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں دو حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک اشتراک' دوسرے امتیاز۔ یعنی ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف صفتوں میں مشترک ہیں۔ مثلاً انسان انسانیت میں مشترک ہے اور اپنے خاص خاص تعینات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اسی طرح جتنے جاندار ہیں' ان سب میں جاندار ہونا مشترک ہے۔ اور انسان اور گھوڑا ہونا ان کو آپس میں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی طرح تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے وہ وجود ہے۔ ممکن میں اور واجب میں دونوں میں وجود پایا جاتا ہے۔ اسی وجود سے ہونا مراد نہیں[1]۔ بلکہ وہ حقیقت مراد ہے' جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر کسی موجود کرانے والے کے موجود ہے۔ اس لئے کہ یہی ذریعہ وجود ہے۔ لہٰذا اسے خود پہلے موجود ہونا چاہیئے۔ اور یہی وجود تمام چیزوں کو حاوی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر شئے معدوم ہے۔ اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں وہ اعتباری ہیں۔ اس لئے اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا یہی وجود خدا تعالےٰ کا عین ذات ہے۔ اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں' ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے۔ اور ہر شخص کی علیحدہ شخصیت علاوہ وجود کے صرف اعتباری ہے۔"

مولانا محمد قاسمؒ نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب "تقریر دلپذیر" میں اس پر بحث کی ہے فرماتے ہیں:۔

"..... ہم اسی کو خدا جانتے ہیں جو بے عیب اور بے نقصان ہے اور اسی سے وجود کون ومکان ہے۔ سب چیزیں اُسی کے سہارے اور بھروسے پر قائم ہیں۔ وہ کسی کے سہارے کا محتاج نہیں۔ وہ سب کی اصل ہے اور سب اس کی فرع ہیں۔"

"وہ سب کی اصل ہے اور سب اس کی فرع ہیں" اس کی تشریح حضرت مولانا محمد قاسمؒ یوں کرتے ہیں۔

"جس کارخانہ کو دیکھئے۔ ایک اصل پر قرار ہے۔ نور آفتاب کو دیکھئے تو ہزاروں مکانوں اور ہزاروں روشن دانوں میں جدا جدا جلوہ دکھلا رہا ہے۔ پر سب کو آفتاب کے ساتھ رابطہ ہے ... عدد کے سلسلے کو نظر کیجئے تو ایک سے الیٰ غیر النہایہ پھیلا ہوا ہے ... موجوں اور بلبلوں کے کارخانہ کو دیکھئے تو سب کی

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحبؒ "سطعات" میں لکھتے ہیں۔ "سرِ سخن این است وجود کہ بمعنیٰ ہستی نہ بمعنیٰ مصدری ..."

اصل وہی ایک جڑ ہے۔ آدمی وغیرہ کو دیکھئے تو سب کی اصل جسے انسانیت وغیرہ کہئے مشترک ہیں۔ اسی طرح جس طرف نظر پڑتی ہے کوئی ایسا کارخانہ نظر نہیں آتا کہ اس کا سر منشاء نہ ہو۔ پھر ان سر منشاؤں کو دیکھئے تو ان کا کوئی اور سر منشاء ہے۔ اور اسی طرح اوپر چلے چلو۔ مثلاً مجھ میں تم میں ہندو مسلمان، نصاریٰ یہود وغیرہ میں تو آدمیت مشترک ہے اور وہی سر منشاء ہے۔"

اور اس آدمیت کے خواص یہ ہیں:۔

"اس نے ہر فرد بشر میں اپنی حکومت پھیلا رکھی ہے۔ اور اپنے احکام مثل کلام و گفتگو شکل و صورت کے جاری کر رکھے ہیں۔ تمام اس کی رعیت اور تابعدار ہیں۔ جو صورت ملتی ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ جو انداز ملا اس سے بدل نہیں سکتا۔ بول چال کا تمغہ اپنے جی سے دور نہیں کر سکتا۔"

انسانوں کا سر منشاء آدمیت ہے جو ان سب میں مشترک ہے۔" اسی طرح گھوڑوں میں اور سر منشاء ہے۔ اور گدھوں کی اور اصل ہے اور کتوں کی اور اصل ہے۔"

غرض مولانا محمد قاسمؒ کے الفاظ میں:۔

"ان سب اصلوں کی اصل جاندار ہونا ہے۔ ادھر نباتات کی علیحدہ اصل ہے۔ اور ان کا اور ہی سلسلہ اور اور ہی سر منشاء ہے۔ پھر ان کی اصل اور جانداروں کی اصل جسمیت کے زیر حکومت ہے۔ اسی طرح اوپر تک چلے چلو سارے عالم میں وجود مشترک ہے۔"

غرض جب تمام موجودات میں وجود مشترک ہے کہ اگر وجود نہ ہو تو یہ موجودات بھی نہ ہوں تو اس سے بعض ارباب تصوف نے یہ نتیجہ نکالا کہ وجود اور موجودات ایک دوسرے کی عین ہیں۔ مولانا محمد قاسمؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں: "شئے مشترک عین اشیائے متعددہ نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ اس لئے یوں سمجھ میں آتا ہے، وجود عین عالم اور عین موجودات نہیں۔۔۔۔ وجود عالم میں اور خود عالم میں فرق ہے۔ یہ دونوں بالکل ایک شے نہیں بلکہ بایں لحاظ کہ ایک شے کبھی موجود ہوتی ہے اور کبھی معدوم، یوں معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا وجود ایک خارجی چیز اور ایک عارضی شے ہے۔ اور ذاتی نہیں۔۔۔۔ (جب) اس عالم کا وجود اصلی نہیں بلکہ ایک عارضی چیز ہے تو جیسے گرم پانی کی مثلاً گرمی جو اصلی نہیں عارضی ہے آگ کا فیض ہے جس کی گرمی اصلی ہے ایسے

ہی اس عالم کا وجود عارضی ہے کسی موجود اصلی کا فیض ہوگا۔ اور وہ موجود اصلی ہی اس عالم کا خُدا اور خالق ہے۔ مگر چونکہ سب کا وجود ایک طرح کا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اوپر مذکور ہوا تو جیسے آفتاب سے گو ہزارہا جگہ دھوپ پھیلی پر سب کے سب ایک ہی آفتاب کا فیض ہے۔ ایسے ہی یوں سمجھنا چاہیئے کہ تمام عالم کا وجود بھی ایک موجود حقیقی اور اصلی کا پرتو ہے سو اُسی کو ہم خدا کہتے ہیں۔"

آگے چل کر مولانا محمد قاسمؒ اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں "..... جتنے جہان میں پھیلاؤ ہیں، وہ کسی ایک شے کی طرف سمٹے چلے آتے ہیں.... کلو بدھو چند خصوصیات کا نام ہے کہ جن میں آدمیت مشترک ہے۔ اسی طرح آدمی گھوڑا گدھا وغیرہ چند خصوصیات کا نام ہے کہ جن میں زندگی اور جاندار ہونا مشترک ہے اسی طرح اوپر تک چلے چلو۔ سب سے اوپر جو اشتراک ہے تو وجود میں ہے یعنی وجود سب میں مشترک ہے....."

اب یہ ساری موجودات وجود میں تو مشترک ہیں، لیکن ان میں ہر ایک میں اپنی خصوصیات بھی ہیں جن کے سبب وہ ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی اپنی کتاب "ہمعات" میں وجود پر مفصل بحث کی ہے۔ اُس کے اردو ترجمے سے اس بحث کا مختصر خلاصہ درجِ ذیل کیا جاتا ہے:-

"زید ایک فرد ہے اس سے اوپر نوعِ انسان ہے اور نوع سے اوپر جنس کا مرتبہ ہے۔ یہ جنس حیوان ہے حیوان کی جنس میں نوعِ انسان بھی داخل ہے۔ اور جملہ حیوانات کی انواع بھی۔ جنس سے آگے جنسِ عالی کا مرتبہ ہے۔ اس میں حیوانات کے ساتھ ساتھ نباتات بھی شامل ہیں۔ اور اس سے اوپر جسم یعنی عرض کا مرتبہ ہے۔ اور عرض سے اوپر جوہر ہے۔"

اس جوہر و عرض سے اوپر اعلیٰ تر جو حقیقت ہے، اس کے بارے میں "حکماء" اور "اہلِ حق" میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:-

"اس معاملے میں حکماء کا یہ حال ہے کہ وہ مظاہرِ وجود اور اس کے تعینات کی اصل کا سراغ لگاتے لگاتے اس مقام پر پہنچے اور یہاں پہنچ کر نہ صرف یہ کہ وہ رُک گئے، بلکہ انھوں نے قطعی طور پر یہ سمجھ لیا کہ جوہر و عرض کے درمیان کوئی ایسا علاقہ نہیں جو دونوں کو ایک جنس کے تحت جمع کر دے۔ لیکن اس کے برعکس اہلِ حق نے معلوم

کر لیا کہ جوہر و عرض دونوں کو ایک اور اعلیٰ تر حقیقت احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن حکماء اس حقیقت کا ادراک کرنے سے عاجز رہے کیونکہ اور حقائق کی طرح اس حقیقت کے احکام و آثار متعین نہیں کہ ان کی مدد سے یہ حکماء اس حقیقت کا سراغ لگا لیتے جو عرض و جوہر دونوں پر حاوی ہے۔ اس حقیقت جامع کا موزوں ترین نام "حقیقت وحدانیت" ہے۔ گو کبھی کبھی ہم اس حقیقت کو "وجود" بھی کہہ لیتے ہیں۔"

اس کی مزید وضاحت شاہ صاحبؒ یوں فرماتے ہیں:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ان سب (موجودات) سے اوپر اور ان سب کو جمع کرنے والی اور جو ان سب کا موضوع ہے، صورتِ جسمیہ ہے۔ جسے اشراقین نے "مادۂ اولیٰ" کہا ہے۔ یہ صورتِ جسمیہ جو اثر پذیر مادہ بھی ہے اور علتِ فاعلیہ بھی، وجود کے اصل مرکز کی طرف راجع ہے۔ الغرض انواع کے ایک ایک فرد سے لے کر وجودِ اقصیٰ تک نظامِ کائنات کا یہ سارا سلسلہ نہایت مرتب اور منظم ہے اور نیچے سے اوپر تک اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے۔

"یہ وجود اقصیٰ اور بعد میں جن مظاہر میں اس کا ظہور ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ لکھے ہوئے حروف کے مقابلے میں سیاہ لکیر ہو یعنی ان حروف کی اصل تو سیاہ لکیر ہی ہے گو بعد میں اسی لکیر نے حروف کی شکل اختیار کر لی۔ یا جیسے مختلف اعداد کی نسبت اکائی سے ہوتی ہے یعنی اکائی ہی سے تمام اعداد نکلتے ہیں۔ ایک ہی وجود میں مظاہر کی اس قدر کثرت کا واقعہ ہونا اس کی مثال دریا کی سمجھئے کہ اس میں لاتعداد موجیں ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس مسئلے میں صحیح ترین رائے یہ ہے کہ وجود وہ ہے جو خود اپنی ذات میں قائم ہے۔ اور مرتبہ وجود میں جبکہ کوئی اور چیز اس کے ساتھ ملحق نہیں ہوتی اور وہ خالص وجود ہوتا ہے تو وہ کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ وجود مختلف ماہیات میں ظہور کرتا ہے چنانچہ یہ ماہیات اسی وجود کے لئے قوالب بن جاتی ہیں۔ ان ماہیات میں سے ہر ماہیت کی اپنی ایک حیثیت اور اس کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"اب یہ سوال باقی رہا کہ یہ جامع حقیقت جو عرض و جوہر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، جس کا موزوں ترین نام ہم "حقیقتِ وحدانیت" بتا آئے ہیں، جسے ہم کبھی کبھی "وجود" بھی کہتے ہیں، آخر یہ حقیقت ہے کیا؟ ایک قوم کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت عین ذاتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے

اسی حقیقت کو "لابشرط شئی"[1] ذات بحت سمجھا اور اسی کو وہ "بشرط لا شئی" احدیت کہتے ہیں۔ اور یہی اُن کے نزدیک "بشرط شئی" واحدیت ہے۔ ہمارے خیال میں ان لوگوں میں عقل و تدبر کی کمی تھی کہ انھوں نے اس غلط بات پر یقین کر لیا۔ ان کے برعکس فقیر نے اس امر کی تحقیق کی تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وجود کے جس مرتبے پر جا کر ان لوگوں کی نظر رکی اور اُسے ہی انھوں نے غلطی سے ذات بحت، احدیت اور واحدیت سمجھ لیا، وہ مرتبہ تو ظاہر الوجود کا تھا، جس کو ہم نفس کلیہ کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہر شے میں جاری ساری اور ہر شے سے قریب ہے۔ اور اس کے باوجود یہ سب اشیاء سے پاک اور اُن کی تمام آلائشوں سے منزہ ہے۔

"نفس کلیہ کے مقابلے میں جو حیثیت ان اشیاء کی ہے، وہی حیثیت ذاتِ الٰہی کے مقابلے میں اس نفس کلیہ کی ہے۔ بلکہ نفسِ کلیہ اشیاء سے باوجود قرب کے جس قدر دور ہے، اس سے سو گنا زیادہ ذاتِ الٰہی نفس کلیہ سے دور ہے۔ اسی طرح وہ اس کے تمام تعینات اور تقییدات کی حدبندیوں سے بھی مبرّا ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک بات کا ضرور خیال رہے کہ نفسِ کلیہ اور اس سے اوپر وجود کے جو مراتب ہیں اُن پر ذاتِ الٰہی از قبیلِ ابداع[2] موثر ہوتی ہے نہ کہ از قسم خلق۔ ابداع سے مراد یہ ہے کہ مادہ کے بغیر عدم سے وجود کا صدور

---

[1] ذات الٰہی سے کائنات کے تنزل کی صورت یوں بیان کی جاتی ہے:۔ ایک مقام تو خود "ذات" کا بحیثیت ذات کے ہے۔ اس مقام پر ہر شرط کی نفی کے ساتھ خود ذات کو اپنی ذات کا ادراک ہوتا ہے۔ یہاں سے تنزلات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں پہلا مرتبہ "احدیت" کا ہے۔ اور "احدیت" کے بعد "واحدیت" کا مرتبہ ہے۔ اسی "واحدیت" کو "باطن الوجود" بھی کہتے ہیں۔ "باطن الوجود" سے "وجودِ منبسط" کا ظہور ہوا جس کا دوسرا نام "ظاہر الوجود" بھی ہے۔ اس مرتبہ "ظاہر الوجود" کو "نفسِ کلیہ" کا نام دیا گیا ہے۔ "نفسِ کلیہ" سے ارواح، امثال اور اجساد ظاہر ہوئے۔

[2] شاہ صاحب کی کتاب "سطعات" میں ہے:۔ (وجود) در سہ مرتبہ است۔ ذات بحت و مرتبہ عقل و شخص اکبر۔ صدور مرتبہ عقل از ذات بحت بہ طریق لزوم و اقتضائے ذات است مانندِ اقتضائے اربعہ زوج را در ذہن ما و مانندِ فیضان ضوء از قرص در خارج۔

اس طریقِ لزوم کو ابداع کہتے ہیں۔ سورج سے روشنی کا پھوٹنا یہ طریقِ لزوم ہے۔

اور ایک چیز سے دوسری چیز کا پیدا ہونا خلق کہلاتا ہے۔

"الغرض نفس کلیہ اور ذات الہٰی میں خلق کی نہیں بلکہ ابداع کی نسبت ہے۔ اور ابداع کی نسبت کو عقلِ انسانی ادراک کرنے سے کلیتہً قاصر ہے۔ اس لئے نفسِ کلیہ اور ذاتِ الہٰی میں فرق مراتب کرنا عقلاً ممکن نہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص تسامح سے یہ کہہ دے کہ نفسِ کلیہ ذاتِ الہٰی کا تنزل ہے تو اس کا یہ کہنا اجمالاً ایک وجہ رکھتا ہے......"

جیسا کہ "سطعات" میں ہے۔ وجود کے تین مرتبے ہیں:۔ ذاتِ بحت، مرتبۂ عقل اور شخصِ اکبر۔ مرتبۂ عقل ذاتِ بحت سے صدور بہ طریق لزوم ہے۔ اور شخصِ اکبر کا ذاتِ بحت سے صدور مرتبۂ عقل کے صدور کی شرط سے ہے۔

غرض "سب موجودات کا سلسلہ ایک موجود اصلی پر تمام ہوتا ہے"[۱] اور یہ موجودِ اصلی نہ صرف خود موجود ہے بلکہ اوروں کا وجود اس سے اس طرح نکلتا ہے۔ جیسے آفتاب سے شعاعیں[۲]۔ اب شعاعیں اور چیز ہیں اور اُن کے در و دیوار پر پڑنے سے جو دھوپ پیدا ہوتی ہے وہ اور چیز۔ دھوپ میں ایک تو اُس کی "ذات" ہے۔ دوسرے اس کا "وجود"۔ اُس کا "وجود" تو عطیہ ہے آفتاب کی شعاعوں کا۔ اور اس کی "ذات" وہ ہے جو سے دوسروں سے تمیز کرتی ہے۔[۳]

موجودات کی "ذات" اور ہے اور اُن کا "وجود" اور۔ مولانا محمد قاسمؒ "تقریر دلپذیر" میں اس پر یوں بحث فرماتے ہیں:۔

"......اس عالم کی ہر چیز کا چھوٹی سے لے کر بڑی تک "وجود" اور ہے اور "ذات" اور ہے۔ یعنی دو وجود ہیں

---

۱ تقریر دلپذیر مولانا محمد قاسمؒ۔

۲ "......شعاعیں بھی مثلِ آفتاب ہی کے اصل سے منور ہیں ہاں اتنی بات ہے کہ آفتاب کو نہیں پہنچتیں۔ کیونکہ اول تو وہ آفتاب سے پیدا ہوئیں۔ دوسرے وہ بات کہاں جو کہ آفتاب میں ہے۔ (تقریر دلپذیر)

۳ ذات اُسی کو کہتے ہیں جس سے تمیز حاصل ہو۔ جیسے مکان کے نقشے کو اُس کی ذات کہا جاتا ہے۔